مفکرِ احرار چودھری افضل حقؒ

تلخیص: عبدالمجید قریشی

میرا افسانہ

جنگ آزادی کے جانباز سپاہی مجلس احرارِ اسلام کے عظیم رہنما صاحبِ طرز ادیب مفکر احرار چودھری افضل حق مرحوم کی زندگی کے درخشاں درخشاں واقعات جو افسانے سے زیادہ دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔ جناب عبدالمجید قریشی نے چودھری صاحب کی خود نوشت "میرا افسانہ" کے باب اوّل کی تلخیص کی ہے جو ہدیہ قارئین (ادارہ)

میرے بچپن کی کہانی استاد کی مار پیٹ سے شروع ہوتی ہے۔ زندگی کا پہلا واقعہ یوں یاد ہے کہ تعلیم کے ابتدائی درجے میں داخلے کا پہلا دن تھا۔ پیشاب جو لگا، میں جماعت سے باہر چلا گیا۔ فارغ ہو کر واپس آیا تو خلیفہ جی (استاد) سے ازار بند باندھنے کی فرمائش کی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ خلیفہ جی کو بچوں کے ازار بند باندھنے سے چڑ ہے۔ پہلے ہی دن مجھ پر پیغمبری وقت آن پڑا۔ خلیفہ جی کا غصہ ان کی عقل اور فرض سے زیادہ تھا۔ انہوں نے ازار بند باندھنے کے بجائے مجھے مارنا شروع کر دیا۔ اس بدسلوکی کا سزاوار میں ہی نہ تھا بلکہ وہ کئی ایک لڑکوں کا پیشاب پہلے بھی خطا کر چکے تھے۔ غرض پہلا سبق جو استاد نے پڑھایا وہ یہ تھا کہ مدرسے میں پیشاب نہ کرو۔

اس پہلے دن کی بدشگونی کی نحوست اسکول کے ابتدائی چند سال ساتھ رہی۔ ایک تو ان دنوں یوں بھی مدرس باتوں کی نسبت لاتوں اور ہاتھوں سے زیادہ کام لیتے تھے۔ دوسرے میں ہم جماعتوں میں جسمانی لحاظ سے کمزور تھا۔ کمزور پر رحم کا کہیں بھی قاعدہ نہیں نتیجہ یہ تھا کہ استاد عموماً پیٹا کرتے تھے۔ اس طرح پیٹتے پٹاتے پانچویں جماعت میں پہنچ گیا۔ یہاں کے ماسٹر صاحب کی ایک آنکھ نہ تھی۔ مگر غصہ خلیفہ صاحب سے دوگنا تھا۔

پہلے دن میں اور چند لڑکے اسکول سے گھر دور ہونے کے باعث ایک آدھ منٹ بعد پہنچے تو ماسٹر صاحب نے نہایت اطمینان سے فرمایا: "کان پکڑلو!" ہم معذرت کیا ہی چاہتے تھے کہ اس نے اچانک لڑکوں پر ڈنڈا برسانا شروع کر دیا۔ فوراً سب کان پکڑ کر کھڑے ہو گئے۔ البتہ ایک تربیت یافتہ لڑکا جھکا اور ٹانگوں کے اندر سے ہاتھ ڈال کر کان پکڑ کر کبھی ایک ٹانگ پر اور کبھی دوسری ٹانگ پر بوجھ ڈالتا ہوا جھومنے لگا۔ ہم اس دلچسپ نظارے کو زیادہ دیر تک دیکھنے نہ پائے تھے کہ ماسٹر صاحب کا غصہ طوفان بن گیا اور وہ بُری طرح ہم پر برسا۔ اُس نے ایک سانس میں سو سو گالیاں دی۔ دستِ ستم پیشہ کو ہم پر ہزار بار آزمایا۔ ہم رونا چاہتے تھے تو مہلت نہ دیتا تھا۔ جب وہ زور آزمائی کرتے کرتے تھک گیا تو ہمیں اتنی مہلت نصیب ہوئی کہ ٹانگوں کے نیچے سے ہاتھ ڈال کر آسمان اور زمین کے متوازی ہو گئے۔ اسی پر بس نہیں کی بلکہ اُس نے تھوڑی دیر کے بعد اسی حال میں کتابیں کھول کر پڑھنے کا حکم دیا۔

یہ ۱۹۰۴ء کے واقعات ہیں۔ اسی سن میں صبح کے وقت کانگڑے کا قیامت خیز زلزلہ آیا جس نے پنجاب بھر کو خوابِ غفلت سے بیدار کر دیا۔ کچھ عرصہ تو سب نے سمجھا کہ قیامت آ گئی۔ مائیں بچوں کو گھروں میں چھوڑ کر جان بچانے کھلی جگہ کی طرف بھاگیں نفسا نفسی کا وہ عالم تھا کہ بجز اپنی ذات کے کسی کو کسی کا خیال نہ رہا۔ مجھے گھبراہٹ

میں والدہ کی آواز سنائی دی کہ چوک میں چلے جاؤ! میں اور میرا بھائی فضل حق بھاگ کر باہر نکلے۔ ہمارے پہنچتے پہنچتے وہاں اچھا خاصا ہجوم ہو چکا تھا۔ سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ سب خدا سے رحم مانگ رہے تھے۔ ناگاہ مسجد کا ملا بھاگا بھاگا آیا اور اس نے آتے ہی اذان کہنا شروع کر دی۔ پھر کیا تھا سب چھوٹے بڑے اذان دینے لگے۔ ان ہی میں ایک مادرزاد برہنہ نوجوان عورت باحال پریشان کانوں میں انگلیاں دے کر "لو کو اللہ اکبر، وے لو کو اللہ اکبر!" کہتی اِدھر اُدھر بھاگتی پھر رہی تھی۔ برہنگی کی طرف تو میں اب اشارہ کر رہا ہوں۔ اس پریشانی میں کسی کو کچھ ہوش نہ تھا۔ ننگے اور لباس والے سب برابر تھے۔

کچھ عرصہ ہوا ایک مقام پر قربِ قیامت کا ذکر جاری تھا کہ قیامت کو لوگ ننگے ہوں گے۔ نہ اُن کو خود ننگے ہونے کا احساس ہو گا نہ ہوش۔ میں نے اُس موقع پر کانگڑے کے زلزلے کی پُربیبت داستان سُنائی اور اس برہنے بی بی کا ذکر کیا تو سامعین بے حد متاثر ہوئے۔

شوخی اور شرارت میں بندر اور بچے برابر ہوتے ہیں۔ ہر سوراخ میں انگلی ڈالنا ان کی خوشی ہے۔ طالب علمی کی ساری تلخ اور خشک زندگی میں یہ شرارتیں بے آب و گیاہ صحرا کے لمبے سفر میں اچانک ایک مسکراتا مرغزار آنکھوں کے سامنے آجانے کے برابر ہے۔ استاد ہزار کان! اینٹھیں، مگر یہ بھی اُن کے کان کترتے ہیں۔ ساتویں جماعت کے اُردو کے استاد بڑے جابر اور تیز طبیعت تھے۔ چھڑی اندھے کے لٹھ کی طرح گھما کر بلاوجہ مارتے تھے۔ ایک لڑکے نظیر حسین کو معمولی بات پر غیر معمولی پیٹا۔ تو وہ پٹ کر شوخ ہو گیا۔ ایک دن اس نے لڑکوں کو اپنی راہ پر لگایا اور انہیں پٹی پڑھائی کہ اردو کی پہلی کتاب کی نظم "صبح کی سیر" کا پہلا مصرع استاد کے آتے ہی مل کر بلند آواز سے پڑھنا، جب مولانا اس بنچ کے لڑکوں کی طرف متوجہ ہوں تو پہلی بنچ کے لڑکے دوسرا مصرع اسی طرح بلند آواز سے پڑھیں اور دوسرے شعر کا پہلا مصرع چوتھی بنچ والے اس طرح اُستاد صاحب شیش محل میں کتے کی طرح گھبرا کر کبھی اُدھر کی بنچوں کو پیٹنے کے لئے بھاگیں گے اور کبھی اِدھر کی! یارو! بڑا تماشا ہو گا سب کو معلوم تھا کہ اس تماشے کا نتیجہ مار پیٹ ہو گا مگر باوجود اس کے سب نے اس تماشے پر رضامندی کا اظہار کیا۔

مولانا محترم ایک شاہی شان سے جماعت میں جلوہ فرما ہوئے۔ سب لڑکے تعظیم کے لئے سروقد کھڑے ہو گئے۔ مولانا نے کمال فرو غرور سے نظر اُٹھا کر سب کا جائزہ لیا اور آنکھ کے اشارے سے سب کو بیٹھ جانے کو کہا۔ لڑکوں کے بیٹھتے ہی شریر نظیر نے اشارہ کیا۔ درمیانی بنچ کے طالب علموں نے اونچے سروں میں الاپنا شروع کیا!

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی
اجی--- سویرے جو کل آنکھ میری کھلی

مولانا حیران رہ گئے اور گردن اٹھا کر دیکھنے لگے ابھی وہ وادیٔ حیرت میں سرگرداں تھے اور درمیانی بنچ کے لڑکوں پر حملہ آور نہ ہونے پائے تھے کہ پہلی بنچ کے لڑکے مل کر گانے لگے:

عجب تھی بہار اور عجب سیر تھی
اہا جی--- عجب تھی بہار اور عجب سیر تھی

مولانا کی آنکھوں سے غیض و غضب کے شرارے نکلنے لگے۔ پہلی بنچ پر ہاتھ اٹھانے کی مہلت نہ پائے تھے

کہ چوتھی بنچ سے آواز آئی۔

یہی جی میں آئی کہ گھر سے

ہاں جی----- یہی جی میں آئی کہ گھر سے بس

مولانا چوتھی بنچ کی سرزنش کے لئے بڑھے ہی تھے کہ پانچویں بنچ سے صدا بلند ہوئی:

ٹہلتا ٹہلتا ذرا باغ چل

جی ہاں----- ٹہلتا ٹہلتا ذرا باغ چل

مولانا کمرے کے درمیان کھڑے حیران ہو رہے تھے کہ اچانک ان کی نظر نظیر پر پڑی جو مولانا کی سراسیمگی پر بغلیں بجا رہا تھا۔ بس پھر کیا تھا مولانا نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ سب کو چھوڑ کر نظیر کو پکڑ لیا۔ چھڑی کے ٹوٹ کر ٹکڑے اُڑ گئے۔ تو مولانا گھونسوں اور مکوں سے کام لینے لگے۔ اُنہوں نے جسم تول کر ایک گھونسا جو مارا تو نظیر نے جسم چُرا لیا۔ وار خطا ہو کر مولانا کا گھونسا پورے زور سے دیوار پر لگا۔ شدت درد سے ان کے منہ سے "ہائے" کی آواز نکلی اور انہوں نے زخمی ہاتھ بغل میں دے دیا اور نیم جاں ہو کر کرسی پر جا بیٹھے۔ ذرا جان میں جان آئی تو پھر اٹھے اور نظیر کو ساتھ لے کر ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس گئے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب یورپین تھے۔ مولانا انگریزی زبان سے بے خبر تھے۔ نظیر ہی دونوں کے درمیان ذریعۂ گفتگو تھا۔ جو مولانا کہتے یہ اُلٹی سمجھاتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا سرگشتہ اور نظیر فاتحانہ انداز میں کلاس میں داخل ہوا۔

اگرچہ میں عام بچوں کی طرح کھلنڈرا تھا مگر انگریزی کھیلوں سے کوئی شغف نہ تھا۔ گلی ڈنڈا، کبڈی اور کبھا کبھار کشتی محبوب مشغلہ ہوتا۔ ایک دن ہم کبڈی کھیل رہے تھے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگنے کے باعث ایک کتا جو سڑک پر جا رہا تھا ڈر سے بھاگا اور ایک سادھو کی ٹانگوں میں گھس گیا جو کشکول میں آٹا لئے کبڈی کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ سادھو پٹاخ سے زمین پر گرا اور آٹا مٹی میں مل گیا۔ سادھو کے پاس ایک اور تماشائی کھڑا تھا۔ اس نے اُس کو پکڑ لیا کہ مجھے تو نے گرا دیا ہے۔ وہ بے قصور ہونے کی ہزار قسمیں کھاتا تھا لیکن سادھو ماننے میں نہ آتا تھا۔ ایک شخص نے کہا کہ کتے کے دھکے سے بڑے سے بڑا پہلوان گر جاتا ہے تب اسے یقین آیا۔

۱۹۰۸ء میں میں نویں جماعت میں داخل ہوا تو زمانے میں میرا مذہبی یقین شبہات کی نذر ہونے لگا اور ہستیٔ باری تعالیٰ کے متعلق باوجود عقل کی گواہی کے دل بے یقین سا ہو گیا۔ اس کی عظمت و جلال کی شہادت کے لئے گو قدرت جلوؤں کی دنیا آنکھوں کے سامنے بے نقاب کر رہی تھی لیکن دل سے اطمینان جاتا رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ یقین ایک جنت تھی جو مجھ سے چھین لی گئی ہے۔ اور میں بے اطمینانی کے دوزخ میں ڈال دیا گیا ہوں۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ کتنی دعائیں اس یقین کو واپس لانے میں صرف ہوئیں۔

ایک دن میں پریشان حال بلکہ کے بُت کے پاس سے گزر رہا تھا کہ ایک عورت جو حُسن کا کشمیر تھی سامنے سے گزری۔ ہر چند حسن و عشق نے دل میں جگہ نہ پائی تھی مگر رنگ و نقش کے امتزاج کو دیکھ کر خدا یاد آ گیا۔ زبان سے نکلا کہ یہ اشرف المخلوقات بغیر پیدا کرنے والے کے پیدا نہیں ہو سکتی! یقین نے پھر طبیعت، پر اطمینان کی جنت کے دروازے کھول دیئے۔

انہی دونوں میرے محلے میں ہیضے کی وبا پھیلی۔ اس کی لپیٹ میں میں بھی آگیا۔ مجھ پر موت کا کوئی خوف و ہراس نہ تھا۔ لیکن گھر کی صفائی اور علاج سے پرہیز نہ تھا۔ جان بچ گئی؟ البتہ صحت کے لحاظ سے زندہ در گور ہو گیا۔ خدا جانے ہیضہ ہونے سے جسم میں کیا زہر پھیلا کہ طبیعت بھرپور طور پر بحال نہ ہوئی میں باوجود خرابیٔ صحت کے انٹرس اسلامیہ اسکول امرتسر سے پاس کر کے اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہو گیا۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ صحت تعلیم کا ساتھ نہ دے سکے گی۔ تاہم کوشش جاری رکھی۔ غلطی سے سائنس اور حساب دونوں لے لئے اس لئے کالج میں کامیابی کی امید مشتبہ ہو گئی۔

کالج میں آکر میں نے بائیسکل چلانی سیکھی۔ پرانی سی ایک بائیسکل مل گئی تھی۔ مجھے ایک ہفتے کے اندر چڑھنے کی مہارت تو ہو گئی مگر چلانے کی پوری مشق نہ ہوئی نتیجہ یہ تھا کہ آدمی جدھر بچ کر جاتا تھا میری بائیسکل اسی کا تعاقب کرتی تھی۔ کئی دفعہ کئی شریفوں کی ٹانگوں میں بائیسکل پھنسانے کی نادانستہ کوشش کی۔ کئی مجھ پر غصے ہوئے۔ کئی ایک پر میں ناراض ہوا۔ شہری لوگ مجھ کو اناڑی سمجھ کر میرے سر ہوتے تھے کہ ہاتھ سیدھا نہیں ہوا اور بابو صاحب سائیکل سوار ہو گئے۔ دیہاتوں پر میں بے جا رعب جماتا تھا کہ راہ دیکھ کر نہیں چلتے۔

ایک دن میں موچی دروازہ کے نشیب کی طرف سائیکل پر سوار آرہا تھا بائیسکل پرانی ہونے کے باعث نہ بریک لگتی تھی نہ گھنٹی بجتی تھی۔ گھنٹی کا فرض زبان کو ادا کرنا پڑتا تھا۔ بائیسکل بد کے ہوئے گھوڑے کی طرح اوپر سے نشیب کی طرف سرپٹ دوڑ رہی تھی۔ میں برابر "ہٹو بچو" پکار رہا تھا۔ شامت اعمال ایک برقعہ پوش عورت سڑک کے کنارے کنارے جا رہی تھی میرے شور سے گھبرا کر سڑک کے دوسری طرف بھاگی نہ بائیسکل میں بریک تھی نہ میں ایسا مشاق کہ بی بی سے بچ نکلتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں راہ بیچ گرے۔ عورت پر میں اور مجھ پر سائیکل تاہم میں جھٹ سے اٹھا عورت نے پڑے پڑے ہزار صلواتیں سنائیں۔ کسی نے عورت کو سنبھالا۔ ایک نے میرے کپڑے جھاڑے۔ میں اس کی مہربانی کا شکریہ ادا کر کے پھر بائیسکل پر چڑھ گیا۔ شومئی قسمت سے آگے سڑک پر چھڑکاؤ کیا گیا تھا۔ مجھے یہ علم نہ تھا کہ بائیسکل بھی پھسل جاتی ہے۔ اب وہ جو پھسلی تو میں پھر زمین پر آرہا۔ اس دفعہ تو یوں معلوم ہوا کہ کوئی دیوزاد مجھے زمین پر پٹخ گیا۔ جگہ جگہ زخم لگے۔ بصد مشکل کالج پہنچا بس اس دن سے اس شیطانی چرخے پر چڑھنے سے توبہ کی۔

بد قسمتی سے میں ۱۹۱۲ء میں ایف اے میں فیل ہو گیا۔ دوسرے سال دیال سنگھ کالج میں داخلہ لیا۔ یہاں پہلی دفعہ غیر مسلم اسٹاف سے واسطہ پڑا۔ ایک دن ہمارے پروفیسر مترا نے فارسی پڑھاتے ہوئے برسبیل تذکرہ کہا کہ ہجرت کے کئی سو سال کے بعد مسلمانوں نے تصوف کو غیر مسلموں سے لیا ہے۔ اس کی یہ بات مجھ پر بجلی بن کر گری۔ تصوف میرا اوڑھنا بچھونا ہو چکا تھا۔ میں نے ایک مذہبی دیوانے کی طرح پروفیسر مترا کو ٹوک دیا کہ آپ ابھی اسلام سے واقف نہیں۔ اس لئے ایسا کہتے ہیں۔

پروفیسر نے میری طرف تعجب سے دیکھا اور مسلمان طالب علموں نے میری جرأت کی داد دی۔ دوسرے روز پروفیسر بہت سی کتابیں لے کر آیا اور حوالے پر حوالہ دینا شروع کیا کہ قرونِ اولیٰ میں تصوف کا کوئی نام نہ جانتا تھا۔ خانقاہ، تکیہ اور تصوف کا لفظ قرآن بھر میں نہیں رسولِ عربی ﷺ سے نہ دم کشی ثابت نہ قلب پر ضربات

لگانے کا کہیں ذکر۔ یہ علم صاف طور پر غیر اسلامی ہے اور اسلام میں چوتھی صدی ہجری کی پیداوار ہے۔ جب مسلمان یونانی اور ہندوستانی فلسفۂ مذہب سے دوچار ہوئے تو انہوں نے تصوف کا پیوند اسلام میں لگا دیا۔ پروفیسر نے کہا کہ جاؤ تصوف اور شریعت کے کسی عالم کے پاس پہنچ کر پہلی تین صدیوں میں مسلمانوں میں تصوف کی موجودگی کا کوئی مستند حوالہ لاؤ۔ میں قائل ہو جاؤں گا۔

میں نے کہا: "پروفیسر صاحب اگر مسلمان علماء اور صوفیاء کے پاس یہ سند نہ ہوتی تو یہ خانقاہیں اور تکیے نہ ہوتے وہ ذکر کا شغل جاری نہ رکھتے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی چیز کو داخلِ عبادت و دین سمجھنا بدعت ہے"۔

پروفیسر: "اور یہ بھی کہو کہ بدعت گمراہی ہے!"

میں: "جی ہاں بدعت گمراہی ہے۔ کیونکہ دین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کامل ہو چکا ہے"۔

لاہور کے علماء سے میری واقفیت نہ تھی۔ اس لئے امرتسر اپنے ایک استاد کے پاس گیا۔ وہ قرآن کے مکمل ہونے پر ہمیشہ زور دیتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ جو تصوف کو قرآن میں ڈھونڈتا ہے وہ خدا اور رسول پر بہتان باندھتا ہے۔

وہاں سے ایک اہلِ حدیث بزرگ کے پاس گیا۔ انہوں نے فرمایا! تصوف کی باتیں غیر مستند ہیں۔ کتاب اور سنت پر اعتقاد رکھو! یہی کامل ہدایت ہے۔ اور اس بات میں تمہارا پروفیسر برحق ہے"۔

ان کی زبان اور بیان میں بڑی نرمی تھی لیکن میرے لئے کوئی بات باعث تسلی نہ ہوئی کیونکہ دفعتاً اپنے اعتقادات کو بدلنا آسان نہ تھا۔ یہاں سے اٹھا اور اپنے ایک پیر بھائی کے ہاں پہنچا۔ وہ شریعت اور طریقت کے شاہسوار مانے جاتے تھے اور فی الحقیقت بے شمر شخص تھے۔ ان سے اپنی مشکل بیان کی انہوں نے کہا کہ یہ علم سینہ بہ سینہ پہنچا ہے ہر شخص اس علم کا اہل نہیں اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص خاص اصحاب کو راز دار بنایا اور طرح یہ طریقہ ہم تک پہنچا۔

یہ بات ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہو گئی۔ پروفیسر کو آکر آخری بات کہی۔ اس نے حقارت سے میری طرف دیکھا اور کہا کہ مجھ کو جھٹلانے کی کوشش میں اپنے پیغمبر ﷺ پر بہتان باندھنے لگے۔ یہ پیغمبر ﷺ کو خدا کا یہ حکم کہ میرے احکام کھول کھول کر بیان کرو اور وہ سینہ بہ سینہ بیان کرے!

میری آنکھوں کے آگے اندھیرا سا آگیا۔ میں نے گردن جھکالی میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

انگلستان میں اس وقت شہنشاہیت کا آفتاب نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ اور پوری دنیا میں اس کا کوئی سیاسی حریف نہ رہا تھا۔ البتہ جنگجو جرمنی چند سال سے سر اٹھاتا نظر آتا تھا۔ مدبرین انگلستان کی دور بین نگاہوں نے جرمنی کے خطرے کو قیاست بنتے دیکھ لیا تھا۔ جرمنی عقاب کی طرح پر تول رہا تھا کہ ایک ہی اڑان میں سب سے بڑی بلندی پر جا پہنچے۔ انگریزی سیاست غیر مرئی طور پر اس کی گردن میں روس اور فرانس کا حلقہ باندھ چکی تھی۔ یکایک آسٹروی شہزادے کے دن دہاڑے قتل نے یورپ کے خرمنِ امن میں چنگاری کا کام دیا۔ یوں معلوم ہوا کہ چاروں طرف خشک بارود کو آگ لگ گئی ہے۔

اٹلی، روس، فرانس اور انگلستان ایک طرف اور جرمنی آسٹریا اور ترکی دوسری طرف برسرِ پیکار نظر آئے۔

اسباب جنگ اور جنگی تدبیر کے لحاظ سے دنیا کے دوسرے ملک جرمنی کی ٹکر کے نہ تھے۔ ہندوستان کے وسیع ذرائع اگر انگلستان کے قدموں پر نچھاور کرنے کو نہ ہوتے تو ایک سال میں لڑائی ختم ہو جاتی۔ ہندوستانی آبادی انگلستان کے لئے ارزاں ترین سپاہی مہیا کر رہی تھی۔ امراء روپیہ فراہم کرتے تھے۔ اور اہل مذہب مندر اور مسجد میں فتح کی دعائیں کر کے عوام الناس کو قابو میں رکھتے تھے۔ ملک کے سامنے کوئی سیاسی مطمح نظر نہ تھا۔ اس لئے انگلستان، ہندوستان سے پورے طور پر بے فکر تھا۔ ہندوستان کی دس لاکھ فوج یورپ کے غربی محاذ پر غلامانہ قربانی کی داد حاصل کر رہی تھی۔ انگریزی فوج کے مسلمان سپاہی ترکی افواج کے سینوں کو چھلنی کر کے اماکن مقدسہ کو انگریز کے لئے فتح کرنے میں مصروف تھے۔ گیارہویں کے ختم پر آمادۂ قتال ہونے والے پیر اور مولوی ہندوستانی سپاہیوں کو برکت کے لئے تعویذ دیتے تھے اور ترکوں کی گولیوں سے محفوظ رہنے کے لئے "دم" کرتے تھے۔

ادھر یہ کیفیت تھی اُدھر کرنل لارنس نے عرب اور عراق کے شیوخ کو طلائی طلسم میں گرفتار کر کے انہیں ترکوں کے لئے خنجر زیر آستیں بنا دیا تھا۔ ایشیا میں سطوت اسلامی خود مسلمان اجیروں کے ہاتھوں برباد ہو گئی تمام ایشیاء اتحادیوں کے ہاتھ میں آ گیا۔ ہندوستانی سپاہیوں اور عربی شیوخ کے پاس تنخواہ کے چند بکسے رہ گئے۔

باوجود اس کے کہ انگریزی سیاست اسلامی سلطنتوں کا خاتمہ کر چکی تھی جرمنی کے دم خم وہی تھے۔ روس کا کچومر نکل چکا تھا۔ جرمن افواج کیسل کی پہاڑیوں پر قابض ہوا چاہتی تھیں کہ امریکہ اتحادیوں کے دام تزویر میں پھنس کر جرمنی پر تازہ دم فوجیں چڑھا لایا۔ جرمنی کے یہودیوں نے انگلستان کے اس وعدے پر غداری کی کہ فلسطین ان کے حوالے کر دیا جائے گا۔ ان وجوہات کی بناء پر فاتح جرمنی مفتوح ہو گیا۔

میری طبیعت کے رجحانات اگرچہ انگریز کی طرف مائل نہ تھے تاہم وقت کے رواج کے مطابق سلسلۂ ملازمت میں منسلک ہو کر حلقہ بگوش انگریز ہو گیا۔ اور ۱۹۱۷ء میں بطور سب انسپکٹر پولیس بھرتی ہو کر قلعہ پھلور ٹریننگ کے لئے چلا گیا سب انسپکٹر پولیس جب تک قلعہ پھلور میں زیر تعلیم رہتا ہے فرعون مزاج ڈرل انسٹرکٹروں کے ہاتھوں ہر قسم کی ذلت اٹھاتا ہے۔ جب پولیس ٹریننگ اسکول کا کورس ختم کر کے ضلع میں آتا ہے تو قلعے کو بھول کر خود فرعون ہو جاتا ہے۔

جب میں قلعے سے ضلعے میں آیا تو تھانہ صدر لدھیانہ کے حوالدار تفتیش نے سمجھایا کہ یہاں سیدھی انگلی گھی نہیں نکلتا یہاں کے لوگ جوتے کے یار ہیں۔ جوتا ہاتھ میں ہے تو سب سلام کرتے ہیں۔ محبت سے پیش آؤ تو پگڑی اتارتے ہیں۔ اس نے مزید سمجھایا کہ تفتیش کے لئے عقل کی ضرورت نہیں۔ جس گاؤں میں تفتیش کے لئے جاؤ پہلے چماروں کے گھروں کی طرف سیدھے ہو لو۔ ان پر بلا تکلف ڈنڈے برساؤ۔ پھر چوکیدار کو بلا کر اس کے منہ پر بے شک بلاوجہ چپت لگاؤ۔ چمار اور چوکیدار کبھی ظلم کی داد رسی نہیں چاہتے۔ بلکہ مظالم پر صبر کرتے ہیں۔ نمبردار کا سوال البتہ ٹیڑھی کھیر ہے۔ پہلے اس کو معمولی سی گالی دے کر اس کے صبر کا امتحان کرنا چاہیئے۔ اگر سؤر، کتے کی گالی برداشت کر جائے تو فحش گالیاں دو۔ یہ گالیاں بھی برداشت کر لے تو بے شک ڈاڑھی پکڑ کر ہلاؤ۔ اگر ان تین مدارج میں سے کسی مرحلے پر ناک بھوں چڑھائے تو تیوری پر بل ڈالے تو وہیں بس کر کے بات ٹال دو۔ جس گاؤں کا نمبردار گالی برداشت کر لے سمجھو کہ وہاں کوئی شخص نہیں جو تمہاری من مانی کارروائی میں مزاحم ہو۔ ایسے گاؤں میں جا کر جس جس پر شبہ نہ بھی ہو بغیر کچھ پوچھے کان پکڑوا دو اور چوتڑوں پر خوب جوتے برساؤ۔ بہتر یہ ہے کہ جوتے

مارنے کا عمل رات کے وقت شروع کیا جائے تاکہ اس کی آواز گھر گھر سنی جائے اور عورتیں پکار اٹھیں کہ حاکم بڑا سخت مزاج ہے۔ اول تو تمہاری پیٹ سے ہی ملزم اقرارِ جرم کر لے گا ورنہ تھوڑے بہت تشدد سے اصل حال معلوم ہو جائے گا۔ اس طرح جرائم کا انسداد بھی ہو جائے گا اور جھولیاں بھی بھر لو گے۔ اگر خدانخواستہ کوئی مقابلہ پر اتر آئے تو خان صاحب کی طرح مقابلہ نہ کرو بلکہ شیخ صاحب کی طرح فوراً مو نچھیں نیچی کر لو۔ اور مناسب موقع تلاش کرو۔ اگر تمہارے سامنے بلوہ ہوتا ہو تو بلوائیوں میں کود پڑنا دانائی نہیں بلکہ وہاں سے کھسک جانا ہی عقل مندی ہے۔ جب بلوائی منتشر ہو جائیں تو بے شک ایک ایک کو باندھ کر سزا دو"۔

میں نے حوالدار صاحب کے ارشادات کو مقدس احکامات کی طرح سنا لیکن مخلوقِ خدا پر بلاوجہ ظلم کا جواز سمجھ میں نہ آیا تاہم بوقتِ ضرورت کام آنے کے لئے ان نصائح کو آویزہ گوش بنا کر رکھا اور تفتیش جرائم کا کام شروع کر دیا۔

دیوتائے عشق کی کارفرمائی کے باعث میرے پڑوس میں زہر خوانی کا ایک کیس ہو گیا۔ ایک عاشقِ قلاش محبوب کی فرمائش کو پورا کرنے کے لئے در در مارا پھرا کہ کہیں سے کچھ قرض مل جائے کسی نے عشق کا راستہ آسان کرنے میں اس کی مدد نہ کی۔ لاچار نوجوان نے اپنی بوڑھی پھوپھی کو دھتورے سے بے ہوش کیا اور نقدی اور زیورات اڑا کر دیوی کے بھینٹ کئے۔ معاملہ بہت صاف تھا عاشقِ حزیں کو جلد ہی محبت کا زیور (ہتھکڑی) پہنا کر منزلِ محبوب یعنی جیل میں پہنچا دیا گیا۔

اس مقدمے سے فارغ ہوا تھا کہ آدھی رات کو مخبری ہوئی بردہ فروشوں کا ایک گروہ ایک خالی بنگلے میں شب باش ہے۔ اور اس کے ہمراہ اغواء شدہ عورتیں ہیں۔ اسی وقت پولیس کی جمعیت کو ساتھ لیا اور بندوق سنبھال کر چل دیا۔ تلاش کرنے پر دیکھا کہ ایک حسینہ، جس کا جسم چاندی سے میلا ہوتا تھا فرشِ خاک پر پڑی سو رہی ہے اور دو مشٹنڈے پہلو میں پڑے ہیں۔ تحکمانہ لہجے میں انہیں جگایا وہ ڈراؤنے خواب کی طرح چونک پڑے اور نکیرین کو سامنے دیکھ کر گھبرائے۔ میں نے کہا: "چلو یومِ حساب آگیا"۔

وہ اٹھے ہم انہیں لے کر تھانے آگئے۔ تینوں بھائی بہن کا رشتہ بتاتے تھے۔ میں نے کہا عورت کو ان سے الگ کر بٹھاؤ۔ تاکہ ان کا جادو اترے تو میں اپنا سر پھونکوں۔ مردوں کو حوالات میں بند کر دیا گیا اور عورتوں کو پہریدار کی نگرانی میں بٹھا کر میں سو گیا۔ صبح اٹھا تو معلوم ہوا کہ عورت پر پہرہ دار سپاہی نے ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے تھے وہ تو خیر ہوئی عصمت دری کی نوبت نہ آئی۔ ورنہ سپاہی کے گناہ پر افسر بھی غفلت کے الزام میں دھر لیا جاتا۔

ہیڈ کانسٹیبل اور سپاہی صبح سے لے کر شام تک عورت سے سر کھپاتے رہے مگر اس نے کوئی بات مان کر نہ دی۔ مردوں کو بھائی بتاتی رہی۔ اگرچہ میں تفتیشِ جرائم میں نوآموز تھا۔ لیکن واقعات شاہد تھے کہ عورت مغویہ ہے ورنہ اجرمی کوٹھی میں شب باشی کے کوئی معنی نہ تھے۔

میں نے بڑے یقین سے تفتیش سارجنٹ کو مخاطب کر کے کہا کہ آپ کی ابتدائی نصیحتوں کو میں نے دل میں جگہ دی ہے۔ لیکن میں کچھ کالا علم بھی جانتا ہوں کان میں وہ افسوں پھونکوں گا کہ عورت مینا کی طرح بولے گی۔

اس نے کہا: "حضور! اگر جنتر منتر سے کام چل جائے تو دردِ سری کیوں کی جائے"۔

میں اٹھا عورت کے کان میں اتنی بات کہی کہ میں کنوارا ہوں۔ تمہارا ان سے پیچھا چھوٹ جائے تو میرے گھر کی رانی بن کر رہو۔ سب نے دیکھا کہ جادو چل گیا۔ عورت کے چہرے پر رونق اور آنکھوں میں چمک آ گئی۔ اس نے ذرا اونچی آواز سے کہا کہ یہ تو مجھے بھگا کر لائے ہیں۔

میں نے شادی کا چکمہ دے کر اس کی دیرینہ آرزوؤں کی تکمیل کر دی۔ اب وہ چھم چھم کرتی تھانے میں ادھر اُدھر آزادی سے پھرنے لگی۔ حسن کے ساتھ تمکنت آ گئی۔ اور وہ چھوٹے درجے کے آدمیوں سے بڑے درجے کی عورتوں کی طرح گفتگو کرنے لگی۔

اگلے روز عدالت میں چالان پیش کرنا تھا۔ اس نے کپڑے بدلے۔ آنکھوں میں کاجل ڈالا اور بازار میں سے نور برساتی چلی۔ وہ کمرۂ عدالت میں اس شان سے پہنچی کہ مجسٹریٹ نے قلم ہاتھ سے رکھ کر اور عینک کو آنکھوں سے ہٹا کر بے ساختہ کہا: "ارے"۔

اگلے روز عدالت نے تاریخ دے دی تا کہ معلوم ہو سکے ملزم سابقہ سزا یافتہ تو نہیں مجھے ایک اور سرکاری کام کے لئے باہر جانا پڑا۔ میری غیر حاضری میں ملزم سزا پا گئے۔ مجھے امید تھی کہ عورت وارثوں کو واپس کر دی گئی ہو گی مگر معلوم ہوا کہ تھانے کا عملہ بردہ فروشی کا کام بھی سرانجام دے لیتا ہے۔ چنانچہ انہیں کے توسط سے گاؤ خورد ہو گئی۔

کیا تفتیش جرائم میں جھوٹ بولنا مناسب ہے؟ میری طبیعت پر بوجھ رہا کہ جو بات پوری کرنے کا ارادہ نہ تھا میں نے وہ کس طرح کہہ دی۔ اسی طرح ایک اور مقدمے میں میں نے قرآن کے بجائے تعزیرات ہند سر پر اٹھا کر ملزم سے اقبال جرم کرا لیا۔ سرکاری کام نکل گیا میری واہ واہ ہو گئی مگر طبیعت مدت بے اطمینان رہی۔ جو قرآن بتا کر تعزیرات ہند قسم کے لئے اٹھائے کیا ایسا شخص خدا کے غضب سے بچ سکتا ہے؟

ان دو مقدمات میں شانِ جمالی سے کام نکل گیا۔ ابھی شانِ جلالی کا ظہور باقی تھا۔ ایک گاؤں میں چوری کی رپٹ درج ہوئی کئی ہزار کا سرقہ بتایا گیا۔ علاقے کے مشہور بدمعاشوں کی فہرست ترتیب دی گئی تو معلوم ہوا کہ موقع واردات کے قریب ہی گاؤں میں ایک بڑا بدمعاش رہتا ہے باوجودیکہ میرے پاس کافی جمعیت تھی محض حماقت کر کے میں ایک کمزور سپاہی کو لے کر اس کی خانہ تلاشی کے لئے چل پڑا۔ وہ بدمعاش یا تو کھڑا تھا یا مجھے چڑانے کے لئے چارپائی پر دراز ہو گیا۔ میں کھڑا اور وہ لیٹا تھا اور لیٹے ہی لیٹے باتوں کا جواب دیتا رہا۔ گاؤں کے دو نمبردار موجود تھے۔ اس کی گستاخی دیکھ کر وہ شوخ ہو گئے۔

مجھے ہیڈ کانسٹیبل تفتیش یاد آیا۔ اگر چماروں اور چوکیداروں سے معاملہ شروع کرتا تو یہ مرحلہ پیش نہ آتا۔ میں شیخ صاحب بن کر بالکل نرم ہو گیا وہ بدمعاش اور بھی ماش کے آٹے کی طرح اکڑ گیا اور نمبردار بھی میرے حال پر ہنسنے لگے۔ بدمعاش کہنے لگا:

"تھانیدار صاحب! تمہارے جیسے بیسیوں ہمارے شاگرد ہیں۔ ہمارے چرن لگے رہو گے تو تھانیداری کر سکو گے ورنہ اللہ بیلی کر دیئے جاؤ گے!"

میں نے اندازِ گفتگو اور بھی بہتر بنایا اور کہا: "بے شک اسی لئے تو میں تمہارے مکان پر حاضر ہوا ہوں تمہاری امداد کے بغیر اس کام میں کامیابی کیسے ممکن ہے!"

وہ اس خوشامدانہ بات سے بن پیئے جھوم گیا۔ لاف زنی کرتا ہوا آہستہ آہستہ میرے ساتھ ہو لیا۔ میں اس کے عالمگیر کارناموں کی داد دیتا ہوا موقعِ واردات تک لے آیا۔ وہاں چار پانچ سپاہی موجود تھے۔ میں نے کہا: "لو بھئی اب کان پکڑ لو!"

وہ میری طرف کمالِ استغنا سے دیکھ کر کہنے لگا: "تھانیدار صاحب! ہمارے ساتھ ایسی باتیں؟"

اب بھیڑ بھیڑیا بن چکی تھی۔ مجھے مزید خوشامد کی ضرورت نہ تھی۔ اس کی گستاخی پر میں خون کے گھونٹ پی رہا تھا آؤ دیکھا نہ تاؤ تڑاخ سے اس کے منہ پر چپت لگائی۔ میرا ہاتھ ہلانا تھا کہ سپاہیوں نے جوتے اٹھالئے لے تیری کی دے تیری کی شروع ہو گئی علاقے کے بڑے بدمعاش کو پٹتا دیکھ کر عورتوں نے گھروں کے دروازے بند کر کے بچوں کو چھاتیوں سے لگا لیا۔

بدمعاش کی تواضع جاری تھی۔ بڑی اکڑی گردن کا آدمی، کان پکڑنے سے برابر انکار کرتا رہا۔ مگر تا کجے مرتا کیا نہ کرتا رات کے بارہ بجے کان پکڑ لئے۔ کان تو پکڑ لئے مگر بات مان کر نہ دی۔ اس تشدد کے بعد مقصد حل ہوتا نہ دیکھ کر میں اس سے مایوس ہو گیا۔ لیکن علاقے کے ذیلدار نے بتایا کہ اس کی ایک داشتہ ہے جس کا اس پر بڑا اثر ہے میں نے صبح اسے بلایا وہ مجھ سے ایسی مرعوب ہو گئی کہ آتے ہی کہنے لگی: "مجھ پر ہاتھ نہ اٹھاؤ مال مسروقہ میں لائے دیتی ہوں"۔

کیا کہوں عورت کی زبان میں کیا جادو تھا ایک دفعہ کہا کہ مال دے دو بدمعاش نے دوسری بات نہ کی نہ صرف وہ سامان بلکہ ایک اور بھی مقدمے کا مال برآمد کرا دیا۔ اس واردات میں اس کے اور شریک کار بھی تھے انہوں نے مجھے کئی ہزار رشوت دینا چاہی۔ اس گروہ نے علاقے بھر کو لوٹ رکھا تھا۔ ان کے حال پر رحم مخلوق خدا پر ظلم تھا۔ رشوت اور سفارش سے بے پرواہ ہو کر میں نے چالان کر دیا۔ مجسٹریٹ نے میری دیانتداری کی بے حد تعریف کی۔ اس گروہ کی سزایابی سے سرقے کی وارداتوں میں کسی قدر کمی ہو گئی۔

ایک روز میں نمازِ فجر سے فارغ ہو کر بیٹھا ہوا تھا کہ مقامی گورنمنٹ اسکول کا ایک بوڑھا سکھ ٹیچر آ گیا ان صاحب کو میں نے اکثر کورٹ انسپکٹر کے پاس دیکھا تھا۔ ہمارے کورٹ انسپکٹر زندہ دل بزرگ تھے۔ ماسٹر مذکور آتے ہی میرے پاؤں پڑ گیا۔ زار و قطار رونے لگا۔ میں حیران تھا کیا معاملہ ہے۔ آخر دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کسی شعلہ رو آوارہ مزاج عورت سے راہ چلتے ماسٹر جی کا دل مل گیا اور وہ اس جوالی مکھی کو گھر لے آئے اور قیمتی ساڑھیاں اور عمدہ زیورات مہیا کئے۔ سات روز میں ڈھائی ہزار خرچ اٹھا۔ وہ گھر والی بن بیٹھی۔ اور یہ خوشی خوشی لڑکے پڑھانے مدرسے چلے گئے۔ پیچھے وہ تین ہزار نقد لے کر دروازے چوپٹ چھوڑ کر چلی گئی۔ ماسٹر جی آئے تو حسینہ ندارد! بھاگے لپکے ادھر ادھر گئے آخر عورت کا سراغ پا لیا۔ اس کے متعلق معلوم ہوا کہ اسی طرح وہ کئی ایک کو بدھو بنا چکی ہے۔ ماسٹر جی اس کا آخری شکار تھے۔

میں نے کہا! "اچھا پرچہ دلاتا ہوں"۔ وہ پھر پاؤں پڑ گیا اور کہنے لگا: "خدا کے واسطے مجھے تعویذ دو!"

میں نے تعجب سے پوچھا: "کیسا تعویذ؟"

اس نے کہا: "جو کورٹ انسپکٹر کو بتایا تھا"۔

میں نے حافظے پر زور دیا تو یاد آیا کہ میاں بیوی کی لڑائی میں یونہی اناپ شناپ تحریر بطور تعویذ میں نے کچھ دن پہلے ایک شخص کو دی تھی اور اتفاق سے وہ معاملہ سلجھ گیا تھا اس واقعے کا ذکر میں نے مذاقاً کورٹ انسپکٹر صاحب سے بھی کیا تھا۔

میں نے ماسٹر صاحب سے ہزار کہا کہ میں تعویذ کا قائل ہوں نہ دیتا ہوں مگر وہ نہ مانا بلکہ پہلے سے زیادہ اصرار کرنے لگا۔ آخر مجبور ہو کر میں نے تعویذ لکھ دیا اور وہ دعائیں دیتا ہو چلا گیا۔ اس تعویذ کے بھروسے پر وہ سیدھا اُس عورت کے گاؤں میں گیا اور ایک خنجر آب دار اُس کے حضور پیش کر کے کہا کہ یا مجھے قتل کر یا جینے کی اُمید دلا۔

ماسٹر جب اس تعویذ کے بل بوتے پر شاعری کر چکا، تو عورت نے بلائیں لیں، خنجر لے کر صندوق میں رکھ دیا اور اچانک پلٹ کر ماسٹر صاحب کے گلے میں اُنہی کی پگڑی ڈال کر چور چور کا شور مچا دیا۔ جب عورت نے یہ قیامت ڈھائی، تو ماسٹر صاحب کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔

شور سُن کر جو آیا، اُسی نے ڈاڑھی کھینچی اور لٹھ برسایا۔ ماسٹر صاحب کی وہ پٹائی ہوئی کہ محبت کا سبق بُھول کر توبہ توبہ کرنے لگے۔ معاملہ پولیس تک پہنچا۔ تو بیان دیا کہ چوہدری افضل حق کا تعویذ لے کر آیا تھا، شاید تعویذ ذرا تیز ہو گیا، اس لیے بات بگڑ گئی۔

ان ہی ایام میں لدھیانے کے ریلوے ورکشاپ میں مزدوروں نے ہڑتال کر دی۔ فکر دامن گیر ہوئی کہ کہیں کوئی سر پھرا ریلوے کو نقصان نہ پہنچائے، اس لیے میں لائن کے ساتھ ساتھ گشت کو نکلا پولیس ماتحتوں کی مختصر جمعیت میرے ہمراہ تھی۔ لودھیوال کے قریب ایک لاش پائی گئی۔ ہزار ٹکریں ماریں، مگر اُس کا کوئی وارث دستیاب نہ ہوا۔ لاش ڈاکٹری معائنے کے لیے بھیج دی گئی۔ ڈاکٹری رپورٹ سے معلوم ہوا کہ موت زہر خوانی سے واقع ہوئی ہے۔

سال کی ابتدا تھی ۳۰۲ کا پرچہ دینا پڑا۔ سال کے شروع میں سنگین واردات کا اندراج تھانے کی کارکردگی کے لیے منحوس سمجھا جاتا ہے۔ بڑی بھاگ دوڑ کی، مگر کوئی سراغ نہ ملا کہ لاش کس کی ہے اور یہاں پہنچی کیسے، چنانچہ اپنا علاقہ چھوڑ ملحقہ تھانہ جات اور اضلاع میں بھی تحقیقات ضروری سمجھی گئی۔

سب انسپکٹر انچارج، متعدد ڈکیتیوں کی تفتیش پر لگے ہوئے۔ کئی ماہ کے بعد تھانے آئے اور اُسی روز تھانہ پھلور کے علاقے میں روانہ ہو گئے۔ وہ گرانڈیل جوان تھے، لیکن ذرا پیٹ بڑھا ہوا تھا۔ شام کے قریب ایک ٹم ٹم پر سوار ہو کر واپس لوٹے۔ اُنہیں مہاجن سمجھ کر ڈاکوؤں کا گروہ اچانک حملہ آور ہوا۔ ایک ڈاکو نے حوصلے سے آگے بڑھ کر بندوق ہاتھ سے چھیننا چاہی۔ دونوں میں کش مکش جاری ہو گئی۔ باقیوں نے لاٹھیوں سے حملہ کر دیا۔ ایک سپاہی اور ہیڈ کانسٹیبل ہمراہ تھے۔ وہ تو گرم سرد دیکھ کر بھاگ نکلے۔ سب انسپکٹر مرد خدا خم ٹھونک کر کھڑا ہو گیا۔ ایک ڈاکو بندوق کی نالی کے سامنے آ کر سر پر ضرب کاری لگانا چاہتا تھا کہ سب انسپکٹر نے بندوق چلا دی، چھرے سینہ کو چھلنی کر گئے۔ وہ لوٹنی کھا کر گرا، پھر سنبھلا اور جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ اُس کے باقی ساتھیوں نے بندوق